بے رحم

محترم ایڈیٹر

سلامِ شوق!

میں ایک عجیب روداد کے ساتھ حاضر ہوں تاکہ لوگ سبق حاصل کریں۔ ہم ہندوانہ معاشرے سے آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہو پائے ہیں۔ دور دراز کے علاقوں، گاؤں دیہات میں ایسے کئی رسوم رائج ہیں جنہیں سن کر لوگ حیرت سے گنگ رہ جائیں۔ اس کنواں سے جڑی باتیں بھی ایسی ہی ہیں۔ گوکہ یہ سنی سنائی باتیں ہیں لیکن ایسی قابلِ نفرت رسوم اگر کہیں رائج ہیں تو اسے ختم ہونا چاہیے۔

غلام قادر
(کراچی)

میں پلوشہ ہوں۔ میں نے ایک ایسے گاؤں میں جنم لیا تھا جہاں توہمات اور جہالت کا راج تھا۔ ابا کی کچھ زمینیں تھیں جن پر وہ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ یہ زمین انہیں ورثہ میں ملی تھی لیکن گھر میں غربت بالکل نہیں تھی۔ ہر سال ابا کو زمینوں سے اچھی آمدنی ہو جاتی تھی اور ہمارا گزر بخوبی ہو جاتا تھا۔ جہالت اتنی زیادہ تھی کہ گاؤں کی کسی بھی لڑکی کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہ تھی۔ مجھ سے بڑے دو بھائی تھے انہیں تعلیم حاصل کرنے کی کوئی ممانعت نہیں تھی۔ دونوں عمر میں کافی بڑے تھے۔ میں اس وقت پیدا ہوئی تھی جب بڑے بھائی وسعت اللہ ساتویں میں تھے جب میں تین سال کی ہوئی تو دونوں بھائیوں نے ابا سے ضد کر کے مجھے اسکول میں داخلہ کروا دیا۔ اسکول جاتے ہوئے مجھے کوئی پریشانی نہ ہوئی تھی۔ صبح ابا کے ساتھ اسکول جاتی اور وہ مجھے اسکول چھوڑ کر کھیت کی طرف نکل جاتے۔

پرائمری تک کوئی پریشانی نہ ہوئی لیکن پانچویں پاس کر کے سیکنڈری میں آئی تو ایک مسئلہ یہ ہوا کہ ابا نے سیکنڈری میں داخلہ لینے پر اعتراض کر دیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ سیکنڈری اسکول گاؤں میں نہیں بلکہ قصبہ میں تھا۔ میں نے بہت کہا کہ گاؤں سے دو لڑکیاں وہاں جاتی ہیں میں بھی ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ ابھی یہ بحث جاری تھی کہ وسعت بھائی شہر سے آ گئے۔ ایک بار پھر دونوں بھائیوں نے ابا کے خلاف محاذ بنا لیا۔ ابا نے لاکھ حجت کی کہ بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو نہیں پڑھانا چاہیے۔ وسعت بھائی نے وضاحت مانگی تو ابا نے جواب میں کہا۔ ''ہاجرہ جو شہر جا بسی تھی اس نے اپنی بیٹی کو پڑھایا تھا، دیکھو اس نے پورے خاندان کے منہ پر کالک مل کر اپنے ساتھ پڑھنے والے سے کورٹ میرج کر لی۔''

وسعت بھائی کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔ ''ابا کیا پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں۔''

ابا نے نفی میں جواب دیا تو وسعت بھائی کو آگے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ''ہاجرہ کی بیٹی کے کورٹ میرج کرنے میں تعلیم کا نہیں بلکہ تربیت کا قصور تھا۔'' وسعت بھائی نے کہا تو ابا کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔

''تربیت کی بات کہاں سے آ گئی۔'' ابا نے کہا تو وسعت بھائی مسکرا دیے اور کہا:

''ابا مجھے شہر گئے ہوئے ابھی دو برس بھی نہیں ہوئے ہیں ورنہ میں اسی گاؤں میں پلا بڑھا ہوں۔ اب وقت بدل گیا ہے۔ بہت سی لڑکیاں اسکول جا رہی ہیں۔ حکومت بھی چاہتی ہے کہ لڑکیاں پڑھیں۔''

اس پر ابا کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے پھر بولے۔ ''اگر کچھ اونچ نیچ بات ہو گئی تو۔''

وسعت بھائی ہنسنے لگے تھے۔ ''ابا آپ میری ماں اور اپنی بیوی کی تربیت پر شک کا اظہار کر رہے ہیں۔''

اور ابا کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا سوائے اس کے کہ ''اگر کچھ ہوا تو اس کے ذمہ دار تم ہی ہو گے۔'' ابا نے کہا۔

www.zemtime.com

بھائی پُرجوش لہجے میں بولے۔ ''ابا مجھے اپنی بہن پر پورا اعتماد ہے کہ یہ کبھی آپ کا اور میرا سر جھکنے نہیں دے گی۔'' اور ابا اس فقرے پر خوش ہو گئے، انہوں نے اجازت دے دی۔

اس اسکول میں میری کئی لڑکیوں سے پہلے ہی مہینے میں دوستی ہو گئی۔ ان میں ایک تو خان صاحب کی بیٹی تھی۔ خان صاحب گاؤں کے زمیندار تھے۔ ان کی بڑی سی حویلی تھی اور وہ باپ کی کار میں اسکول آتی تھی بلکہ اکثر مجھے بھی گھر سے لے لیتی تھی۔ وہ بڑے باپ کی بیٹی تھی لیکن اس میں غرور نام کو نہیں تھا۔ اسکول سے واپسی پر وہ مجھے گھر پر ڈراپ کرتی اور پھر اپنی حویلی جاتی تھی۔ میں پرائمری کی طرح سیکنڈری میں بھی ہمیشہ اوّل آتی تھی جبکہ خان صاحب کی بیٹی کا کلاس میں آخر نمبروں میں سے ایک ہوتا تھا۔

دن گزرتے گئے اور ہم نویں میں پہنچ گئے۔ یہ بورڈ کے امتحان تھے۔ خان صاحب کی بیٹی نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کی پڑھائی میں مدد کروں مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن میں نے شرط رکھی کہ کامن اسٹڈی کے لیے اسے میرے گھر آنا پڑے گا اس پر اس نے کہا۔ ''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن بابا شاید اس کی اجازت نہ دیں۔''

میں ہنس دی۔ ''تمہارے بابا کی شرافت اور دریا دلی کا تو پورا گاؤں معترف ہے۔'' میں نے کہا تو وہ مسکرا کر بولی:

''شاید تم ان کے اس چہرے کی بات کر رہی ہو جو اصل میں ان کا چہرہ نہیں بلکہ نقاب ہے جو انہوں نے اوڑھا ہوا ہے۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو؟'' میں نے کسی قدر غصہ کے عالم میں کہا تھا۔ ایک باپ کے لیے بیٹی کے ایسے خیالات مجھے بہت ناگوار لگے تھے۔

''کاش میں تمہیں حقیقت بتا سکتی میری مجبوری ہے کہ بہت کچھ جانتے ہوئے بھی خاموش رہنے پر مجبور ہوں۔'' اس نے کہا۔ میرا گھر آ گیا تھا اس لیے میں اتر گئی۔

میں اس سے جدا ہو کر گھر تو آ گئی لیکن اس رات کوشش کے باوجود مجھے نیند نہیں آ سکی۔ بار بار میرے کانوں میں خان صاحب کی بیٹی کے الفاظ گونجتے تھے۔

آخر ایسا کون سا راز ہے جسے وہ تو جانتی ہے لیکن بتاتے ہوئے خوفزدہ ہے لیکن اگلی صبح سے کچھ پہلے میں نے اس کے الفاظ ذہن سے جھٹک دیئے تھے۔

''ہوگا کچھ مجھے اس سے کیا۔'' میں نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے بعد میں اس سے کچھ دور رہنے لگی تھی۔ نویں کے امتحان ہوئے اور ہم میٹرک میں آ گئے۔ اسکول کی ہر ٹیچر نے مبارکباد دی کیونکہ میرے نمبر اسکول میں سب سے زیادہ تھے۔

میٹرک میں اور زیادہ محنت کی اور جب امتحان کا زمانہ آیا تو سب کچھ بھول کر کتابوں میں گم ہو گئی۔ امتحانوں سے کچھ پہلے اسکول کی چھٹیاں ہو گئیں۔ اسی زمانے میں وسعت بھائی بھی شہر سے گاؤں آئے ہوئے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہیں بینک میں نوکری مل گئی تھی اور ان کی پوسٹنگ گاؤں کے ساتھ قصبہ میں ہو گئی تھی۔ ادھر میں نے میٹرک کا امتحان دیا اور اسکول میں سب سے زیادہ نمبر تو لیے ہی تھے ڈسٹرکٹ میں بھی میری پوزیشن آ گئی تھی۔

ابا نے میرا شوق دیکھتے ہوئے مجھے کالج میں داخلہ کی اجازت دے دی تھی کیونکہ اب وہ صرف کسان نہیں تھے بلکہ بینک منیجر کے باپ بھی تھے۔ لوگ اب انہیں عزت دینے لگے تھے۔

شہر میں ہمارا کوئی ایسا رشتہ دار نہیں تھا جس کے گھر رک کر میں تعلیم مکمل کر سکتی اس لیے وسعت بھائی نے میرے لیے ہاسٹل میں کمرا بک کروا لیا تھا۔ اسی ہاسٹل میں خان صاحب کی بیٹی بھی آ گئی لیکن گاؤں کا معاشی فرق یہاں بھی واضح تھا۔ وہ ایک بڑے کمرے میں رہتی تھی جبکہ مجھے ایک ایسا کمرا ملا تھا جہاں میرے علاوہ دو اور لڑکیاں بھی تھیں۔

پہلی بار بھائی نے مجھے فون کر کے بتایا تھا کہ وہ مجھے لینے نہیں آ رہے تو میں اپنے کمرے میں اداس بیٹھی تھی کہ خان صاحب کی صاحبزادی میرے کمرے میں آئی اور کہا۔ ''کیوں کیا آج تم گاؤں نہیں جا رہی۔''

میں نے کہا۔ ''بھائی کا فون آیا تھا کہ بینک میں کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ شہر نہیں آ سکتے۔''

میرا جواب سن کر وہ ہنسنے لگی تھی اور کہا۔ ''تو کیا ہوا تم میرے ساتھ چلو۔''

میں نے انکار کر دیا جس پر وہ بولی۔ ''اسکول میں بھی تو میں تمہیں ڈراپ کرتی رہی ہوں۔''

میرا جواب تھا۔ ''تب کی بات اور تھی۔ چند منٹ کی

www.zemtime.com

بات تھی اور میرے ابا کی اجازت بھی تھی لیکن شہر سے گاؤں کا سفر طویل ہے اور میں نے ابا سے اجازت بھی نہیں لی۔''

میں نے جواب دیا تو اس نے کہا۔ ''اب نخرے مت کرو جلدی سے کپڑے تبدیل کرلو، باہر کار میں ابا منتظر ہیں۔'' میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر چینج کرنے چلی گئی۔

ہم دونوں کالج کے گیٹ سے نکلے تو واقعی خان صاحب ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی کہا۔ ''آج تو دو سواریاں ہیں۔'' اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ان کا انداز ہی ایسا تھا جیسے وہ کوئی ٹیکسی چلا رہے ہوں اور سواریاں دیکھ کر خوش ہو گئے ہوں۔

اس کے بعد کا راستہ کس طرح کٹا اس کے بارے میں مجھے احساس ہی نہیں ہوا، پورا راستہ باتوں میں گزر گیا لیکن یہ گفتگو زیادہ تر خان صاحب سے ہوئی تھی اور وہ بھی پڑھائی کے بارے میں تھی۔ مثلاً خان صاحب نے سوال کیا، تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے تو میرے کچھ کہنے سے قبل ہی ان کی بیٹی نے جواب دیا اسکول کی طرح پلوشہ یہاں بھی ہر ٹیسٹ میں اوّل آتی ہے اور میں اپنی تعریف سن کر شرما گئی تھی مگر خان صاحب کے فقرے نے مجھے بری طرح چونکا دیا تھا۔

''حسن اور عقل بہت کم ایک ساتھ ہوتے ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ پلوشہ اس کا ایک حسین امتزاج ہے۔''

خان صاحب نے ایک طرح سے میری تعریف ہی کی تھی لیکن اپنی بیٹی سے دو برس چھوٹی لڑکی کی یوں تعریف کرنا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

''اب تمہارے آگے پڑھنے کے بارے میں کیا ارادے ہیں؟'' خان صاحب نے سوال کیا تھا۔

''میرے ابا ایک غریب کسان ہیں انہوں نے مجھے یہاں تک تعلیم کی اجازت دی یہی احسان بہت ہے۔'' میں نے کہا اور حقیقت بھی یہی تھی کیونکہ میں گاؤں کی پہلی لڑکی تھی جو بی اے تک پہنچی تھی ورنہ زیادہ تر لڑکیاں پرائمری تک تعلیم حاصل کر پاتی تھیں چند ایک نے میٹرک بھی کیا تھا لیکن اس کے فوری بعد ان کی شادیاں ہو گئی تھیں وہ چولہا ہانڈی کرتی اور بچوں کو سنبھالتی تھیں۔

''تمہارا بھائی بھی تو بینک میں ہے اور اس کی تنخواہ بھی بہتر ہے وہ بھی تمہارے تعلیمی اخراجات برداشت کر سکتا ہے۔'' خان صاحب نے سوالیہ انداز میں کہا تھا۔

''کر تو سکتا ہے لیکن میرا ابا سے وعدہ تھا کہ وہ مجھے بی

مجھے چاندنی نوازدو

آنکھوں کے رستے دلوں میں اتر جانے والے ایک پریمی جوڑے کی ادھوری مگر دلچسپ اور انوکھی داستان.....

کاوش صدیقی کے قلم کا جادو

عقاب آب

ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات زویا صفوان کا شاہکار

شہ زور

عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور کثیف سازشوں کے جال اسما قادری کے قلم کا کمال

جنگ باز

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم کی جادوگری

ناہید سلطانہ اختر، شاہ سنان، عائشہ نصیر، عمران قریشی، عاطر شاہین، جاوید بسام، عیوق بخاری و دیگر کی خوب صورت تحریریں

اے کرنے دیں پھر جیسا وہ کہیں گے میں کروں گی۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''بہت سعادت مند بچی ہو۔'' خان صاحب نے کہا اور میں خوش ہوگئی۔ یہ فقرہ ان پر سوٹ کرتا تھا۔

اسی طرح کی گفتگو کرتے ہوئے ہم گاؤں پہنچ گئے جہاں ابا نے ہمارا استقبال کیا اور انہوں نے خان صاحب کا شکریہ ادا کیا تھا کہ انہوں نے ان کی بیٹی کو شہر سے گاؤں پہنچایا۔ ابا کے اصرار کے باوجود خان صاحب گھر کے اندر نہیں آئے۔ اماں اور خالہ جو اس وقت ہمارے گھر آئی ہوئی تھیں انہوں نے بھی خان صاحب کا شکریہ ادا کیا اور میں ابا کے ساتھ گھر میں داخل ہوگئی جہاں کچھ دیر بعد ابا نے مجھ سے کہا۔ ''پلوشہ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے اب تمہیں بھی اپنا وعدہ پورا کرنا ہے۔'' ان کے لہجہ میں عجیب طرح کی سنجیدگی تھی۔

''مجھے بھی اپنا وعدہ یاد ہے۔'' میں نے کہا تو ابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے دعا دی۔

''مجھے یقین تھا کہ میری بیٹی میرا سر جھکنے نہیں دے گی۔'' ابا نے کہا اور پھر کچھ دیر رک کر بولے۔ ''بیٹی میں نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔''

''مگر ابا ابھی تو اگلے مہینے میرے فائنل امتحان ہونے والے ہیں۔'' میں نے صرف اتنا کہا تو ابا ہنس دیئے۔

''ہم بھی تیرا نکاح کل تو نہیں کر رہے۔'' اور میں خاموش رہی پھر انہوں نے بات آگے بڑھائی۔ ''میں جانتا ہوں کہ اگلے مہینے تمہارا آخری امتحان ہے اس کے بعد میری بیٹی بی اے ہو جائے گی۔ اس کے بعد ہم تمہاری شادی کر دیں گے۔'' ابا نے کہا۔ یہ اچھا موقع تھا کہ میں معلوم کرتی کہ میرا ہونے والا شوہر کون ہے اور کس سے انہوں نے رشتہ طے کیا ہے لیکن میں خاموش ہی رہی تھی۔

☆☆☆

وہ جمعہ کا روز تھا جب میں شہر سے گاؤں آئی تھی۔ ہفتہ کو وسعت بھائی کی چھٹی ہوتی تھی اور انہوں نے ناشتے کے بعد مجھ سے کہا مجھے تم سے بات کرنی ہے اور میں ان کے ساتھ ان کے کمرے میں آگئی جہاں انہوں نے مجھے بتایا کہ میرا رشتہ میرے خالہ زاد سے ابا نے طے کر دیا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ابا ایک نان میٹرک کے ساتھ میرا رشتہ کیسے طے کر سکتے ہیں لیکن میں نے کچھ کہا نہیں کیونکہ مجھے اپنا وعدہ یاد تھا اور یہ وعدہ میں نے اس وقت کیا تھا جب ابا نے مجھے شہر جا کر اپنی تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دی تھی۔ ابا نے کہا تھا۔ ''دیکھ پلوشہ میں تمہیں شہر جانے کی اجازت تو دے رہا ہوں لیکن یہ یاد رکھنا کہ وہاں تم صرف تعلیم حاصل کرو گی اور واپسی پر جہاں میں رشتہ کروں گا اسے قبول کرو گی۔'' میں نے وہ وعدہ کر لیا تھا اور اس لیے کر لیا تھا کہ اس وقت میری نظروں میں صرف تعلیم حاصل کرنا تھی۔ بھائی سے بات کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں آگئی اور عادل کے بارے میں غور کرنا شروع کیا۔ عادل میرا خالہ زاد تھا لیکن بمشکل میٹرک تک پہنچا تھا اور دو بار میٹرک میں فیل ہونے کے بعد اس نے گاؤں چھوڑ کر قصبہ میں دکان کھول لی تھی۔ وہ ایک گھبرو جوان تھا اور گاؤں کا وہ پہلا جوان تھا جس نے موٹر سائیکل خریدی تھی اور ہر روز سویرے وہ موٹر سائیکل پر قصبہ جاتا تھا۔ وہاں دن بھر دکان میں رہتا اور شام میں گاؤں واپس آجاتا تھا۔ بظاہر عادل میں مجھے کوئی ایسی برائی نظر نہیں آرہی تھی جس کی وجہ سے میں اس سے شادی سے انکار کر سکتی اور نہ ہی میرے پاس ایسا کوئی شخص تھا جسے میں عادل کے نعم البدل کے طور پر پیش کر سکتی۔ یہ بات نہیں تھی کہ کالج میں کچھ لڑکوں نے مجھ میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا لیکن میرے رویئے نے ہر ایک کو مایوس کیا تھا کیونکہ مجھے ان میں سے کسی میں دلچسپی نہیں تھی کیونکہ مجھے ابا سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا۔

جب میں بھائی کے پاس سے اٹھی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں لیکن اتنی ہمت جمع نہیں کر پا رہے تھے کہ مجھ سے کچھ کہہ سکتے۔ امتحانوں کے بعد گاؤں آئی تو ابا نے بتایا کہ انہوں نے خالہ کو اگلے ماہ شادی کی تاریخ دے دی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے بھی اس روایت پر عمل کرنا تھا جو ہمارے گاؤں کی جہالت کی سب سے بڑی روایت سمجھی جاتی تھی اور وہ روایت یہ تھی کہ جس لڑکی کی شادی کی تاریخ طے ہوتی تو اسے گاؤں سے کچھ دور ایک کنویں پر جا کر کنویں سے پانی نکالنا ہوتا تھا۔ کنویں میں ڈول خان صاحب کا باڈی گارڈ ڈالتا تھا اگر ڈول میں پانی صاف نکلتا تو لڑکی کے پاکیزہ ہونے کی گواہی ہوتا لیکن اگر ڈول کے پانی میں مٹی ہوتی اور پانی گدلا نکلتا تو اسے غیر پاکیزہ قرار دیا جاتا۔

میں بچپن سے اس روایت کے خلاف تھی لیکن جب ابا نے مجھ سے اس سلسلے میں بات کی تو میں مطمئن تھی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ پانی صاف اور شفاف ہی نکلے گا مگر پھر مجھے یاد آیا

www.zemtime.com

کہ ابا کی اکلوتی بہن بھی اس عذاب سے گزری تھی۔ پھوپو رباب کا شمار گاؤں کی ان لڑکیوں میں ہوتا تھا جو بلاضرورت گھر سے باہر بھی نہیں نکلتی تھیں ان کی شادی کی تاریخ طے ہوئی تو انہیں بھی کنویں پر لے جایا گیا جہاں ان کی ڈول میں ریت موجود تھی اور انہیں گاؤں سے کچھ دور اس کمرے میں لے جایا گیا جو کنویں سے زیادہ دور نہیں تھا اور انہیں وہاں پانچ راتیں گزارنی تھیں۔ رباب پھوپو کو اس کمرے میں چھوڑ کر جب ابا واپس آئے تو اماں نے ان سے خوب جھگڑا کیا۔

''میں رباب کی پاکیزگی کی قسم کھا سکتی ہوں؟'' اماں نے کہا تھا۔

''تمہاری قسم پر کون یقین کرے گا۔'' ابا نے ناراض لہجے میں کہا تھا۔

''تم کس طرح شکی بھائی ہو کہ صرف ڈول میں ریت دیکھ کر اپنی بہن کے گناہ گار ہونے پر یقین کر رہے ہو۔''

اماں نے کہا تو ابا غصہ میں آگئے۔ ''میں تمہاری قسم پر یقین کر کے گاؤں والوں سے تو نہیں لڑ سکتا۔ ویسے بھی کئی نسلوں سے گاؤں میں یہی روایت ہے کہ پانچ دن کے لیے اس گناہ گار لڑکی کو کمرے میں تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے اور پانچ دن بعد جب وہ وہاں سے آتی ہے تو اس کے پاکیزہ ہونے کا سب کو یقین ہوتا ہے۔'' ابا نے غصے سے کہا تھا اور اماں منہ دیکھتی رہ گئی تھیں مگر وہ خاموش نہیں رہی تھیں۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ڈول میں پہلے سے ریت موجود ہو کیا کسی نے کنویں میں ڈالے جانے سے پہلے ڈول کو دیکھا تھا۔'' اماں نے کہا اور ابا کا پارہ آسمانوں کو چھونے لگا تھا۔

''پانچ دن صبر کر لے پانچ دن بعد رباب پھر ہمارے ساتھ ہوگی۔'' ابا نے کہا اور مجھے گود میں اٹھا کر وہاں سے چلے آئے۔

☆☆☆

میں کنویں پر گئی اور ڈول سے پانی نکالا گیا۔ میں نے چاہا کہ پہلے ڈول کو چیک کر لوں لیکن جیسے ہی میں نے قدم اٹھانا چاہا ابا نے مجھے روک دیا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ڈول کنویں سے باہر نکلا تو اس میں گدلا پانی تھا۔ مجھے اب اپنا حشر سامنے نظر آ رہا تھا۔ ابا اور خان صاحب کے لوگ مجھے اس کمرے تک لائے جس میں ایک لوہے کا دروازہ تھا اور دروازے پر ایک بڑا سا تالا تھا۔

میں کمرے میں آئی تو کمرے میں پوری طرح اندھیرا نہیں تھا باہر کی کچھ روشنی کمرے میں آ رہی تھی لیکن اس نیم اندھیرے کمرے میں مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے اس ہلکی سی روشنی میں دیکھا تو مجھے کمرے میں نہ کوئی بلب نظر آیا نہ کوئی ایسا بورڈ نظر آیا جس میں بٹن ہوتے ہیں۔ البتہ دروازہ میں ایک کنڈی نظر آئی تو میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اندر سے کنڈی لگا لی۔ پھر مجھے ایک اور دروازہ نظر آیا میں نے اسے کھولا تو وہ باتھ روم کا دروازہ تھا میں نے اس دروازے کو بھی اندر سے بند کر لیا۔ رات آہستہ آہستہ اتر رہی تھی اور کمرے کے اندر کا اندھیرا بھی تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا گیا۔

یا اللہ کیا میرا حشر بھی پھوپو رباب کی طرح ہوگا۔ میں نے اندھیرے کمرے میں ڈر میں اپنے رب کو یاد کیا اور اس کے ساتھ ہی میں نے رونا شروع کر دیا۔ مجھے پھوپو رباب یاد آ گئی تھیں جنہیں پانچ روز بعد ابا لینے گئے تھے لیکن واپسی میں ان کی لاش لائے تھے۔ گھر پہنچنے تک ان کی لاش نیلی ہو چکی تھی۔ گاؤں والوں نے اس پر کہا تھا کہ یا تو اس نے خودکشی کی ہے یا اسے سانپ نے کاٹا ہے۔

اماں خودکشی والی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں اس لیے بول پڑی تھیں۔ ''خودکشی کے لیے اس کے پاس زہر کہاں سے آیا۔''

اس بات سے ابا بھی متفق ہو گئے مگر انہوں نے کہا ''کمرے میں نہ کوئی کھڑکی ہے نہ کوئی ایسا راستہ جس سے سانپ آ سکے۔'' ابا نے کہا تھا۔

پوسٹ مارٹم میں شاید بات واضح ہو جاتی لیکن اس کے لیے شہر کے اسپتال لاش لے جانی پڑتی جو ممکن نہ تھا۔ گاؤں میں کار صرف خان صاحب کے پاس تھی اور ابا اس سے اس درخواست کے موڈ میں نہیں تھے۔ ہمارے گھر تو کار بھائی کی بینک کی نوکری کے بعد ہی آئی تھی۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی اور میں اندھیرے کمرے میں بچھی دری پر گھٹنوں میں منہ دیئے روئے جا رہی تھی اور جو سورتیں مجھے یاد تھیں انہیں دہرا رہی تھیں۔ مجھے اندھیرے سے زیادہ کتوں اور بھیڑیوں کی آوازوں سے ڈر لگ رہا تھا۔ قرآن کی آیتیں دہرانے سے دل کو کچھ سکون آیا تھا۔

وہ رات کا آخری پہر تھا جب پہلے اس دروازے پر دستک ہوئی جس پر تالا تھا پھر ایک وقفہ کے بعد باتھ روم کے دروازے پر بھی دستک ہوئی۔ دستک کی وجہ سے میں کچھ اور

www.zemtime.com

سکڑ گئی تھی اور تیزی سے آیتوں کا ورد کرنے لگی تھی۔ مجھے حیرت اس بات پر بھی تھی کہ جب میں نے غسل خانہ میں جا کر دیکھا تھا تو مجھے وہاں کوئی کھڑکی یا دروازہ نظر نہیں آیا تھا۔ اگر کوئی کھڑکی یا دروازہ نہیں تھا تو یہ دستک دینے والا باتھ روم تک کیسے پہنچا۔ میں یہی سوچتے ہوئے اس دری پر سوگئی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے وہی حالت اس وقت میری بھی تھی۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں موجود روشنی صبح ہونے بلکہ دن چڑھنے کا پتا دے رہی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی مجھے بھوک محسوس ہوئی تھی اس لیے اس تھال کی طرف بڑھی جس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ بھوک لگے تو اس میں سے کھالینا۔ اس تھال پر اک کپڑا ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے کپڑا ہٹایا تو اندر کچھ پھل موجود تھے۔ یکے بعد دیگرے میں نے تین کیلے حلق سے نیچے اتارے باقی دوسرے وقت کے لیے رکھ دیئے اور پھر لیٹ گئی۔ گزشتہ رات جاگتی رہی تھی اس لیے کچھ ہی دیر میں نیند آگئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو شاید شام ہو رہی تھی۔ میں دوبارہ سے باتھ روم میں آگئی۔ میں وہ کھڑکی یا دروازہ تلاش کر رہی تھی جس کے ذریعے وہ شخص باتھ روم میں آیا تھا۔ روشنی بہت تیزی سے کم ہو رہی تھی اور میں جلد سے جلد وہ کھڑکی یا دروازہ تلاش کرنے میں مصروف تھی جس سے دستک دینے والا آیا تھا ساتھ ہی میں اپنے رب سے بھی مخاطب تھی۔

''اے دلوں کے بھید جاننے والے تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں کس طرح کی لڑکی ہوں میں نے تو جان کر کوئی نماز بھی قضا نہیں ہونے دی۔ اب میری اور میرے خاندان کی عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔''

میں دعائیں کرتی جا رہی تھی اور دروازہ یا کھڑکی تلاش بھی کرتی جا رہی تھی کہ میرے کان میں اذان کی آواز آئی اور میں نے سوچنا شروع کیا کہ کوئی تو درز ایسی ہے جس سے یہ آواز مجھ تک پہنچ رہی ہے۔ میں نے سوچا اور اپنی تلاش اور تیز کر دی۔ بظاہر کچھ نظر نہیں آرہا تھا لیکن اچانک میرا ہاتھ ایک جگہ ٹکرایا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ جگہ جہاں میرا ہاتھ لگا تھا وہ سیمنٹ سے بنی ہوئی نہیں ہے۔ میں نے اسے مزید ٹھونک کر دیکھا تو اس میں سے ایسی آواز آئی جیسی ہارڈ بورڈ سے آتی ہے۔ وہ جگہ ہارڈ بورڈ سے ہی بنی ہوئی تھی اور اس پر وہی رنگ کر دیا گیا تھا جو دیوار پر تھا اس لیے پہلی نظر میں وہ دیوار ہی نظر آتی تھی۔ کچھ دیر تو میں وہیں کھڑی یہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی کہ یہاں دیوار کے ساتھ ہارڈ بورڈ لگانے اور اسے چھپانے کے لیے دیوار کا رنگ دینے کی کیا ضرورت تھی جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے ہارڈ بورڈ کے اس حصے کو باہر کی جانب دبانا شروع کیا اور کچھ دیر بعد ہی مجھے اس کا نتیجہ مل گیا۔ وہ ہارڈ بورڈ اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور اس کم ہوتی ہوئی روشنی میں مجھے نظر آیا کہ وہاں ایک خالی جگہ تھی جسے کھڑکی بھی کہا جا سکتا تھا۔

اب میں یہ سوچنے لگی کہ وہ شخص جو وہاں آیا تھا وہ تھا کون اور یہاں تک کس راستہ سے پہنچا تھا ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ مجھے گول سیڑھیاں نظر آئیں جو لوہے کی بنی تھی۔ کم ہوتی روشنی میں اس سے زیادہ نہیں دیکھ سکی تھی کیونکہ اب اندھیرا پوری طرح چھا گیا تھا لیکن اس اندھیروں میں مجھے اپنی رہائی کی ایک کرن بھی نظر آرہی تھی اور میں بغیر کچھ سوچے اس لوہے کی سیڑھیوں سے اترنے لگی جب میرے پیر زمین پر لگے تو پیروں میں گیلی مٹی تھی۔ میں اس پر دھیان دیئے بغیر آگے بڑھتی گئی وہ ایک طویل گلی تھی میں اس گلی میں تیز قدموں سے آگے بڑھتی رہی وہاں گھپ اندھیرا تھا لیکن رہائی کی کرن ایسی تھی کہ مجھے اس اندھیرے سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔ میں چلتی رہی چلتی رہی یہاں تک کہ میں وہاں پہنچ گئی جہاں آگے کوئی راستہ نہیں تھا وہ گلی کا آخر تھا۔ مجھ پر مایوسی طاری ہونے لگی اور اس کے ساتھ ہی اندھیرے نے تیزی سے ہاتھ پھیلانے شروع کیے اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرا ہاتھ کسی لوہے کی چیز سے ٹکرایا ہے۔ میں اپنا دوسرا ہاتھ بھی اس سمت میں لے گئی تو محسوس ہوا کہ یہ بھی ایک لوہے کی اسی طرح کی سیڑھی ہے جس سے اتر کر میں اس گلی میں آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔

میں نے پوری احتیاط کے ساتھ سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا لیکن کچھ ہی دیر میں وہ سیڑھیاں ختم ہوگئیں اور میرا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ چوٹ ایسی تھی کہ میں کچھ دیر وہیں آخری سیڑھی پر بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد میں اٹھی اور اسے چیک کرنے لگی جس سے میرا سر ٹکرایا تھا۔ میں نے کچھ دیر مزید اسے چیک کیا تو وہ مجھے ڈھکن سا محسوس ہوا کچھ اس طرح کا ڈھکن جو عام طور پر لگایا جاتا ہے۔ مجھے پھر سے بھوک لگنے لگی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے باہر سے کچھ آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ باہر نکلنے کا راستہ ہے بلکہ کمرے تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ آوازیں کچھ دیر بعد ختم ہوئیں تو میں نے اپنی پوری قوت سے کٹر کے ڈھکن کو باہر کی جانب دھکیلنا شروع کیا اور آخر

www.zemtime.com

اس میں اتنا راستہ بنانے میں کامیاب ہوگئی کہ رینگتے ہوئے باہر نکل آئی۔ میں باہر تو نکل آئی لیکن پہلا جھٹکا مجھے جگہ کو پہچاننے میں لگا تھا۔ یہ حویلی کے باہر کا عقبی حصہ تھا۔ خان صاحب کی وہ حویلی جہاں میں چند بار آئی تھی۔ یہ کس طرح ممکن ہے میں خان صاحب کے بارے میں سوچتے ہوئے بڑبڑائی تھی۔ اچانک میرے کانوں میں ان کی اپنی بیٹی کے الفاظ گونجے تھے۔ جسے تم ان کا چہرہ کہہ رہی ہو وہ ان کا ماسک ہے۔

خان صاحب کی شہرت ایسی تھی کہ کوئی بھی شخص ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ شخص گاؤں کی مسجد کمیٹی کا صدر ہے اور گاؤں میں کسی بھی لڑکی کی شادی ہو اس میں ہر طرح کا مالی تعاون کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا اور ان کی یہی شہرت تھی جس کی وجہ سے گاؤں کی کوئی بھی عورت ان سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ میں بھی ان میں شامل تھی جو ان کی دل سے عزت کرتی تھی اور تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ پہلے میں نے فیصلہ کیا کہ میں حویلی میں جا کر خان صاحب کو پوری بات بتادوں لیکن پھر میری چھٹی حس بیدار ہوئی اور میں ایک اوٹ میں ہوگئی تھی کیونکہ میں نے خان صاحب کو ان کے اس باڈی گارڈ کو اپنی اس جانب آتا دیکھ لیا تھا۔ ایک لمحہ کی بھی تاخیر ہوتی تو وہ دونوں یا ان میں سے ایک مجھے دیکھ لیتا۔ میں جس اوٹ میں تھی وہاں سے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو پوری طرح سے سن سکتی تھی اور انہیں کوئی ڈر تو تھا نہیں کہ وہ نیچی آواز میں بات کرتے۔ پہلی بات خان صاحب نے کی تھی۔

''آج بھی اس حرام زادی نے دروازہ نہیں کھولا تو باتھ روم والا دروازہ کاٹ دینا۔'' خان صاحب نے کہا۔

''ضروری سامان ساتھ لے لینا اور ٹارچ بھی ساتھ رکھنا۔''

یہ باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے میں باہر نکلی تھی۔ خان کے گارڈ نے وہ ڈھکن پہلے دیکھا تھا اور اسی نے خان کو متوجہ کیا تھا۔ ''صاحب مجھے لگتا ہے کہ وہ لڑکی وہاں سے بھاگ گئی ہے۔'' اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' خان صاحب نے جواب میں کہا تھا لیکن ان کے لہجے میں بھی گھبراہٹ تھی۔

''صاحب جی آپ بھول رہے ہیں وہ رباب کی بھتیجی ہے۔'' گارڈ نے کہا۔

''رباب وہاں سے نکل تو آئی تھی لیکن مجھ سے ہی شکایت کرنے آئی تھی اس کے بعد کیا ہوا تھا وہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' خان صاحب نے کہا۔

''جی صاحب رات بھر آپ اس کے ساتھ عیش کرتے رہے اور صبح میں نے اسے کوبرا سے ڈسوا کر لاش دوبارہ سے اس کمرے میں پہنچادی تھی۔'' گارڈ نے خباثت سے بھرپور لہجہ میں کہا تھا۔

پھوپو کی موت کی حقیقت جان کر میرا دل چاہا کہ میں چیخ مار کر رو دوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ اس صورت میں وہ دونوں دوبارہ سے پکڑ لیتے اور میرا حشر پھوپو سے مختلف نہ ہوتا۔

میں اس وقت تک وہاں چھپی رہی جب تک وہ دونوں ڈھکن اتار کر اس سرنگ میں نہ اتر گئے اس کے بعد میں نے وہاں سے مخالف سمت میں دوڑ لگائی اور بھاگتی چلی گئی۔ رات اندھیری تھی اور میں کچھ نہیں جانتی تھی کہ میں کس سمت جارہی ہوں۔ اپنے طور پر میں گاؤں کی طرف بھاگی تھی لیکن بھاگتے ہوئے کافی دیر ہوگئی لیکن گاؤں نہیں آیا۔ پھر اچانک مجھے اپنے پیروں تلے پکی سڑک کے آثار محسوس ہوئے لیکن میں رکی نہیں بلکہ بھاگتی چلی گئی۔ میرا سانس پھول گیا تھا بھوک کی شدت سے بھی عجیب حالت ہورہی تھی کہ اچانک ایک موڑ مڑتے ہی مجھے دور روشنیاں اپنی جانب آتی ہوئی دکھائی دی تھیں اور میں بے ہوش ہوگئی۔ دن بھر کی بھوک میں تین کیلے کتنا سہارا دے سکتے تھے۔ آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھی اور وہ جو میری آنکھوں کے سامنے تھا وہ خان کا بیٹا تھا۔

''کون ہو تم اور اتنی رات وہاں جنگل میں کیا کررہی تھی؟'' اس نے سوال کیا۔

میں جواب دینا چاہتی تھی لیکن میری زبان سے صرف پانی نکلا تو اس نے ایک نرس کو پانی کے لیے کہا اور اگلے لمحے اس نے پانی سے بھرا گلاس میرے سامنے کردیا۔ میں نے تیزی سے وہ پانی حلق سے نیچے اتارا اور پھر کہا میں بھوکی ہوں خدا کے لیے مجھے کچھ کھانے کو دیں۔

''کھانا بھی مل جائے گا لیکن پہلے بتاؤ تو سہی کہ تم کون ہو اور کہاں سے آرہی ہو کیا کسی نے تمہیں اغوا کیا تھا۔'' میں نے اسے پہچان لیا تھا لیکن وہ مجھے نہیں پہچان پارہا تھا۔

کیونکہ میں کبھی حویلی کی طرف جاتی نہیں تھی۔ بچپن میں ایک دوبار دیکھا تھا مگر جب ہاسٹل میں آئی تو ایک بار وہ

www.zemtime.com

بہن سے ملنے آیا تھا۔ اسے میں نے دور سے دیکھا تھا۔ بعد میں خان صاحب کی بیٹی نے بتایا تھا کہ وہ فوج یا پولیس میں جانے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں کہنا چاہتی اور بہت کچھ بتانا چاہتی تھی لیکن میری آواز میرے حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

پلوشہ تو آسمان سے گر کر کھجور کے درخت میں اٹک گئی ہے۔ میں نے سوچا۔ 'اگر تم نے اسے بتا بھی دیا تو کیا ہوگا یہ اپنے باپ کے خلاف کوئی کارروائی کیوں کرے گا۔' میں نے سوچا اور اسے کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

''اگر تم میرے سوالوں کا جواب نہیں دو گی تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا پھر وہ تم سے تمام کہانی اگلوا لیں گے۔'' اس نے کہا اور پولیس کا سن کر میں گھبرا گئی تھی۔

''سر آپ میرے محسن ہیں لیکن مجھے پولیس کے حوالے نہ کریں۔ مجھے جانے دیں میں اپنے گھر چلی جاؤں گی اور پھر کبھی آپ کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گی۔'' میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے لیکن اسے رحم نہیں آیا اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا اور میں اٹھتی چلی گئی ایک وارڈ بوائے اور دو نرسوں کی مدد سے اس نے مجھے اپنی جیپ میں بٹھایا اور جیپ چلا دی۔

جیپ پولیس والوں کی تھی۔ کیا یہ پولیس والا ہے۔ میرے ذہن نے سرگوشی کی۔

جیپ کچھ دیر چلی تو میں نے ایک بار پھر کچھ کھانے کی فرمائش کی۔ اس نے ایک باربی کیو کے سامنے جیپ روک دی، دو پولیس کے سپاہی تیزی سے آگے آئے اور آتے ہی اسے سیلیوٹ کیا۔ ''دو سینڈوچ اور دو سیون اپ لے آؤ جلدی۔'' اس نے کہا۔

''تو یہ واقعی پولیس کا کوئی افسر ہے۔'' میرے ذہن نے سرگوشی کی۔ میں سینڈوچ اور بوتل سے فارغ ہوئی تو اس نے جیپ آگے بڑھائی۔ تبھی مجھے یاد آیا کہ بہن نے کوشش کا بتایا تھا۔ گویا وہ کوشش میں کامیاب ہو کر افسر بن چکا تھا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' جیپ آگے بڑھی تو میں نے سوال کیا۔

''سوال کرنے کا حق ملزموں کو نہیں ہوتا۔'' اس نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

''میں ملزمہ نہیں ہوں۔''

''یہی تو اتنی دیر سے میں معلوم کرنا چاہ رہا ہوں کہ تم کون ہو؟'' اس نے کہا۔

''میں ایک مظلوم لڑکی ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''اور اس مظلوم لڑکی کا نام کیا ہے؟'' اس نے ایک اور سوال کیا۔ ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ جیپ تھانے میں داخل ہو گئی اور وہاں موجود سپاہیوں نے سیلیوٹ کرنا شروع کر دیے۔

''میرا نام تو تمہیں، تمہاری بہن بھی بتا سکتی ہے دلاور خان۔'' میں نے تلخ لہجہ میں کہا۔

''تم مجھے جانتی ہو؟''

''میں تمہیں ہی نہیں تمہارے پورے خاندان کو جانتی ہوں خاص طور پر تمہارے باپ کو جس نے شرافت اور ہمدردی کا نقاب اوڑھا ہوا ہے لیکن اصل میں شیطان ہے اور ہر برے کام میں مشغول ہے۔'' میں کہنے پر آئی تو کہتی چلی گئی۔

''تم جن کی بات کر رہی ہو وہ میرا باپ نہیں ہے بلکہ میری ماں کا دوسرا شوہر ہے۔'' دلاور خان نے مجھ پر بم گرایا تھا۔ ''اس ہوس کے پجاری نے پہلے میرے باپ کو قتل کروایا صرف اس جرم میں کہ انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ اس نے میری خوبصورت ماں کی جھلک دیکھ لی تھی اور اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا۔ بیوہ ماں اور دو برس کے بچے کو وہ اپنی حویلی لے گیا اور وہاں کچھ روز بعد اس نے نکاح کا ڈراما کیا اور میرا داخلہ بہت اچھے اسکول میں کروا دیا۔''

اب میرا تمام ڈر ختم ہو گیا تھا اس لیے میں نے اسے اپنی پوری کہانی سنا دی جسے اس نے نہایت خاموشی سے سنا اور کہا میں ایسے ہی کسی دن کے انتظار میں تھا پھر اس نے تھانہ کے ایس ایچ او کو چھاپے کی تیاری کرنے کا کہا اور ایک بڑی پولیس پارٹی کے ساتھ وہ سیدھا اس کمرے پر پہنچا جہاں چند گھنٹے پہلے میں قید تھی۔ میں اس کے ساتھ جیپ کی اگلی سیٹ پر موجود تھی۔ پولیس کی آمد کی خبر گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی۔ دلاور نے اپنے پولیس والوں کو تالا توڑنے کی ہدایت کی۔ تالا توڑا گیا لیکن کمرے سے کچھ نہ ملا تو ہم باہر نکل آئے۔ باہر ایک مجمع جمع ہو چکا تھا اور ان میں ابا اور وسعت بھائی بھی تھے۔ وہ مجھے اس طرح پولیس کے ساتھ دیکھ کر حیرت زدہ تھے... پھر دلاور نے میری ہدایت پر حویلی کا رخ کیا اور

www.zemtime.com

حویلی میں گھستا چلا گیا۔ وہاں اس نے خان صاحب کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی تھیں۔ جب وہ اسے ہتھکڑیاں پہنا رہا تھا تو میں دلاور کے پیچھے ہی موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر خان صاحب نے کہا۔ ''آج تو بچ گئی ہے لیکن جیل سے آکر میں تیرا وہ حشر کروں گا کہ تیرے پاس خودکشی کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوگا۔''

''جیل سے واپسی کے بارے میں اب سوچنا بھی نہیں۔'' دلاور نے کہا۔ ''جیل سے تم سیدھے پھانسی کے پھندے پر جاؤ گے۔'' دلاور کے لہجے میں پوری کائنات کی نفرت تھی۔

''بڑے مجرم کو تو گرفتار کرلیا لیکن اس کے ہر جرم کا شریک اب تک آزاد ہے۔'' میں نے گارڈ کی جانب اشارہ کیا اور اگلے ہی لمحے گارڈ کے ہاتھوں میں بھی ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں اور ایس ایچ او کو ہدایات دیں کہ یہ دونوں قاتل ہیں ان کی خوب خاطر مدارات کرنا۔

خان صاحب اور ان کے گارڈ کو ایس ایچ او اپنے ساتھ لے گیا۔ میں ابا اور وسعت بھائی کے ساتھ اپنے گھر آگئی جہاں گھر کے باہر ایک ہجوم جمع تھا لیکن ابا مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ ''اب بیٹی پلوشہ ہمیں اپنی پوری کہانی سناؤ کہ تم پر کیا بیتی اور تم ایس پی دلاور کے پاس کس طرح پہنچیں؟''

میں نے پوری داستان انہیں سنادی جسے بعد میں ابا نے ٹکڑے ٹکڑوں میں گاؤں والوں کو سنائی اور اس کے بعد گاؤں میں جیسے انقلاب آگیا۔ لوگوں نے اپنی بیٹیوں کو اسکول بھیجنا شروع کردیا اور وہ قاتل کنواں بھی گاؤں والوں نے بند کروادیا۔

ابا بڑے فخر سے میری تعریفیں کرتے کہ دیکھا میری بیٹی نے کیسے ہم سب کی آنکھوں سے روایت کی پٹی ہٹائی پھر انہوں نے مجھے یونیورسٹی میں ایم اے کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ میں نے اردو لٹریچر میں داخلہ لیا تھا کہ دلاور اپنی ماں اور بہن کے ساتھ رشتہ لے کر آگیا۔ عادل کا رشتہ تو اسی دن ابا نے ختم کردیا تھا جب خالہ نے ڈول کا گدلا پانی دیکھ کر اونچی آواز میں کہا تھا۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے بیٹے کو اس ناپاک لڑکی سے بچایا۔''

دلاور کا رشتہ آیا تو ابا نے مجھ سے میری مرضی معلوم کی تو میں نے کہا۔ ''ابا آپ جہاں کہیں گے شادی کرلوں گی لیکن اس بار میری شرط ہوگی کہ شادی ایم اے کرنے کے بعد ہی ہوگی۔''

ابا نے دلاور اور اس کی ماں کے سامنے میری شرط رکھی تو وہ فوراً ہی تیار ہوگئے لیکن اصرار کیا کہ شادی بعد میں ہو لیکن منگنی کی رسم اسی ہفتہ ہونی چاہیے اس پر نہ ابا کو اعتراض تھا نہ مجھے۔

منگنی کے بعد ایک روز میں نے وسعت بھائی سے کہا اس روز آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن جھجک سے گئے تھے تو وہ ہنسنے لگے۔ ''اب چھوڑو ان باتوں کو رات گئی بات گئی۔'' لیکن میں نے جب اصرار کیا۔ تو بولے۔ ''میں اس وقت تم سے تمہاری ہونے والی نند کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔''

''تو کیوں نہیں کی۔'' میں نے کہا اور وسعت بھائی ہنس دیئے۔

''تب بھی تم سے مدد چاہنے والا تھا اب بھی مدد مانگ رہا ہوں۔'' انہوں نے کہا اور میں نے اگلے روز ایس پی صاحب کو جامعہ بلوایا۔ ''والد کی تمام حرکات سے واقف ہونے کے باوجود وسعت یہ رشتہ چاہتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اپنے بھائی سے کہہ دینا کہ وہ میری بہن کو بھولے سے بھی اس کے باپ کا طعنہ نہ دے۔''

میں نے دلاور کا پیغام وسعت بھائی تک پہنچایا تو انہوں نے کہا۔ ''تمہارا ہونے والا شوہر کیا مجھے اتنا گھٹیا سمجھتا ہے میں تو اس کا قائل ہوں کہ باپ کے گناہوں سے اولاد کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔''

اسی ہفتہ وسعت بھائی کی منگنی ہوگئی اور ہم دونوں کے ایم اے کرنے کے بعد ہمارے نکاح ہوگئے۔ دلاور کی بہن ہمارے یہاں آگئی اور میں حویلی منتقل ہوگئی جو خان صاحب کی پھانسی کے بعد دلاور اور اس کی والدہ کے نام منتقل ہوگئی تھی۔ شادی کے چھ ماہ بعد میری لیکچرار کی نوکری ہوگئی۔ اب میں صبح کالج جاتی ہوں۔ وہاں سے واپسی پر ساس کا ہاتھ بٹاتی ہوں اور اے ایس پی دلاور کے لیے ان کے من پسند کھانے بناتی ہوں۔ نماز کی پابند میں پہلے بھی تھی لیکن اللہ کی ان مہربانیوں کے بعد اور زیادہ پابندی سے نماز پڑھتی ہوں۔ اس کی رحمتوں کا کچھ تو حق ادا کرسکوں۔

آج ہمارے گاؤں کے ہر گھر میں ایک میٹرک پاس لڑکی موجود ہے۔ ایک دیئے سے نہ جانے کتنے دیئے روشن ہوگئے ہیں۔

++

www.zemtime.com